

## Khawabon Ki Pujaran

[میرا نام سائرہ ہے۔ میں نے ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا تھا۔ بہن کوئی نہ تھی اور بھائی تینوں مجھ سے چھوٹے تھے۔ والد صاحب معمولی درجے کے ملازم تھے لیکن ان کی تنخواہ میں بہ آسانی گزارہ ہو رہا تھا۔ میری ماں کی شادی سولہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھی تھیں۔ بس ایک مسئلہ ان کے ساتھ تھا کہ انہیں ٹی وی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ جلدی جلدی تمام کام نمٹانے کے بعد ٹی وی دیکھنے بیٹھ جاتی تھیں تو پھر اٹھنے کا نام نہ لیتیں۔ سارے ڈرامے دیکھتیں اور اگر موقع ملتا تو xaxa وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھ لیتیں۔ میں ان دنوں چھوٹی سی تھی اور مجھ کو زیادہ شعور نہیں تھا، پھر بھی میں ماں کے ساتھ ٹی وی دیکھتی تھی۔ رفتہ رفتہ شعور کی منزلیں طے کرنے لگی۔ انڈین فلموں میں جو کچھ دیکھتی، سوچتی اے کاش یہ چیزیں ہمارے گھر میں بھی ہوتیں! جوں جوں عمر بڑھتی گئی، شعور بڑھتا گیا۔ فلموں کی دنیا مجھ کو بہت حسین لگنے لگی۔ امی کا شوق برقرار رہا۔ انہیں دھیان نہ رہا کہ میں جوانی کے دور میں قدم رکھ رہی ہوں۔ اب ان کو احتیاط برتنی چاہئے۔ وہ اب بھی میرے ساتھ بیٹھی فارغ وقت میں انڈین رومانی فلمیں دیکھتی تھیں۔ ابو کام پر چلے جاتے اور بھائی اسکول ہوتے۔ یوں مجھ کو بچپن سے ہی نہ صرف یہ کہ فلموں کا چسکا پڑ گیا بلکہ شوق پیدا ہو گیا کہ میں بھی فلموں میں اور ڈراموں میں کام کروں۔ یہ شوق اندر اندر پلٹا رہا۔ اسی وجہ سے دل پڑھائی میں نہ لگتا تھا۔ امی جان نے بھی تربیت میں کوتاہی کی کیونکہ ان کو ڈراموں سے فرصت نہ تھی۔ وہ مجھے قناعت سکھائیں، کلام پاک کا ترجمہ سمجھائیں۔ میں فیل ہونے کے ڈر سے اسکول سے غیر حاضر ہو جاتی۔ اگلے دن اساتذہ ڈانٹتے تھے۔ ٹیسٹ کیوں نہیں دیا۔ میٹرک میں سائنس لے رکھی تھی، فیل ہونا یقینی تھا۔ امی کو پروا نہ تھی۔ ابو نے بھی ٹیوشن رکھ کر نہ دی۔ وہ ٹیوشن کے خلاف تھے، کہتے تھے خود پڑھو اور بچے بھی تو پڑھتے ہیں۔ پڑھائی میں کمزور ہونے کی وجہ سے ہم وقت پریشان رہنے لگی تھی۔ بتاتی چلوں کہ میں معمولی شکل و صورت کی تھی۔ رنگت سانولی اور جسم دبلا۔ لڑکیاں میرا مذاق اڑاتیں تو مجھے برا لگتا۔ سوچنے جو لڑکی ہر وقت تصورات کی دنیا میں رہے، خود کو خیالوں میں پرستان کی پری سمجھے اور بمجولیاں اس کو کلو سائرہ کہیں تو دل پر کیا گزر جاتی ہوگی۔ بہر حال میں نے میٹرک معمولی نمبروں سے پاس کر لیا اور اب کالج میں داخلے کا مرحلہ آگیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد مجھے گورنمنٹ کالج میں داخلہ تو مل گیا مگر سائنس میں نہیں، آرٹس میں کیونکہ نمبر کم تھے۔ میں نے یہی غنیمت جانا کہ جلو کالج لائف تو ملی جبکہ والدین ناراض تھے، کم نمبر کیوں لائی ہو، اچھے نمبر لیتیں، ہم تم کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور تم نے آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ کالج میں قدم رکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ کر کے دکھاؤں گی تاکہ جو لوگ مجھے دھتکار رہے ہیں، مذاق اڑاتے یا ڈانٹتے ہیں، وہ سب عزت کر سکیں میں کو ایجوکیشن والے اسکول سے گرلز کالج آئی تھی لیکن کالج کا اپنا ہی مزہ تھا۔ واقعی کالج لائف بے نظیر ہوتی ہے۔ بوم ورک تھا اور نہ پابندی تھی۔ یہاں بڑی مائٹرن لڑکیاں پڑھتی تھیں جن کے پاس موبائل فونز تھے۔ وہ بڑی شاندار گاڑیوں میں آتیں۔ باوردی ڈرائیور جب ان کی کار کا دروازہ کھولتے تو دل میں حسد ابھرتا۔ ٹھنڈی آہ بھر کر سوچتی ایک دن میں سب کو بتا دوں گی کہ سائرہ کون ہے؟ یہ وہ دور تھا جب خود کو سنبھالنے کی ضرورت ہوتی ہے تاہم مجھ میں یہ صلاحیت نہیں تھی۔ حقیقتوں کا ادراک کرنے کی بجائے مجھے باپ کی معمولی نوکری پر بڑا غصہ تھا۔ میں سوچتی کہ اگر کسی بڑے بزنس میں یا افسر کی بیٹی ہوتی تو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ آرام سے میں اپنے والدین سے اپنے شوق بیان کرتی اور وہ میری ہر آرزو پوری کرتے۔ میں ایک ترسی ہوئی لڑکی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ سرکاری اسکول کی بجائے شہر کے مہنگے اسکول جاؤں۔ مہنگے کالج میں پڑھوں۔ مہنگے پرفیوم اور کاسمیٹکس استعمال کروں۔ تا کہ خوبصورت نظر آؤں۔ فلموں والی راجکماریاں ایسی زندگی گزارنا چاہتی تھیں۔ افسوس کہ کالج لائف اسکول سے بھی بری نکلی کیونکہ کالج میں پسندیدہ طالبہ نہ بن سکی۔ لیکچرار مجھ کو نظر انداز کرنے لگیں۔ لڑکیاں مجھ سے دوستی کی خواہشمند نہ تھیں۔ ایک بار ایک لڑکی نے میری شکایت لیکچرار سے کر دی جس نے مجھے اس قدر ذلیل کیا کہ اور زیادہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ اب میں نے خوب جھوٹ بولنے شروع کر دیے۔ کلاس کی چالاک لڑکیوں سے دوستیاں رکھتی اور باتوں میں خود کو بڑے خاندان کا کہا کرتی۔ فرسٹ انیئر کی چھٹیوں کے دوران میں نے کونسل سے کورس کیا۔ اس دوران وہاں ایک ڈرامہ بن رہا تھا۔ میں نے ڈائریکٹر سے بات کی۔ مجھے دیکھ کر ان کا موڈ تو نہ بنا مگر منت سماجت بھرے لہجے کی وجہ سے شاید ترس کھا کر کہا کہ تم کو ڈرامے میں چانس دوں گا لیکن اگلے دن انہوں نے میری جگہ ایک پیاری سی گوری لڑکی کو ڈرامے میں لے لیا جو بہت مائٹرن تھی۔ مجھے ڈائریکٹر پر غصہ آیا اور شکوہ کیا تو اس گوری لڑکی نے میرا مذاق اڑا کر کہا کہ تم چوبے جیسی شکل والی کو ڈراموں میں کون لے گا، تمہیں تو کوئی نوکرائی کے رول میں بھی نہ لے اور تم ہیروئن بننے کے خواب دیکھ رہی ہو۔ اس دن مجھے بڑا دکھ ہوا۔ کئی دن تک دل میں ارمان دبائے سسکتی رہی کہ اگر مجھ کو چانس مل جاتا تو شاید زندگی بن جاتی۔ شکل معمولی ہو لیکن اداکاری کے جوہر ہوں تو بڑے بڑے مقام خالی ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ میں کسی کو کیسے سمجھا سکتی تھی۔ ایف اے میں نے کر لیا۔ اب کسی اونچے کالج جانا چاہتی تھی جہاں آرٹ اور موسیقی کی کلاسز بھی ہوتی ہوں، جہاں گلوکار اور فنکار فن سیکھتے ہیں۔ ایسے کالج تک میری پہنچ نہ تھی۔ تمنا مگر شدید تھی۔ ہمارے شہر میں لاہور آرٹ کالج کی ایک، برانچ کھلی۔ پتہ کرایا ایک لاکھ روپیہ فیس کا سن کر، میں سن ہو کر رہ گئی۔ بھلا ایسی میری اوقات کہاں تھی۔ بہر حال اپنا کالج چھوڑا اور ایف اے کے بعد ایک دوسرے کالج میں داخلہ لے لیا۔ نئے کالج میں کچھ مائٹرن مضامین بھی پڑھانے جاتے تھے۔ شروع میں تو میں خوش تھی مگر بی اے کی پڑھائی نے جینا حرام کر دیا تھا۔ اس کالج میں انگریزی زبان کا زور تھا اور یہ زبان مجھے آتی نہیں تھی۔ لڑکیاں فرفر بولتیں اور ان کے سامنے نکو بن جاتی۔ اب سوچتی خواہ مخواہ پرانا کالج چھوڑا، وہاں کم از کم ادھی لڑکیاں تو میرے جیسی اردو میڈیم تھیں، یہاں پر ساری انگلش میڈیم تھیں۔ وہ مجھے ذرا بھی منہ نہ لگاتیں۔ احساس کمتری کا ازدہا مجھے بری طرح نگلنے لگا۔ خواہشات دب ضرور جاتی ہیں، مرتی نہیں۔ مجھے بھی دبی ہوئی خواہشات کی ٹی بی دیمک کی طرح چاٹنے لگی۔ بار بار یہ سوچ کر آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے کہ میرا باپ ایک معمولی سرکاری ملازم کیوں ہے، کوئی بڑا سیٹھ کوئی اعلیٰ سرکاری افسر یا سیاستدان کیوں نہیں کہ آج میں ان لڑکیوں کے سامنے کیڑے مکوڑے ایسی حیثیت رکھتی ہوں۔ خدا نے ان کو بنگلے، گاڑیاں بھی دیں اور یہ انگلش میڈیم اسکول میں بھی پڑھیں۔ حالات نے مجھ کو نچوڑ دیا تھا کہ میرا تھوڑا بیت حسن بھی برباد کر دیا۔ اصل میں تو سوچوں کا پرتو چہرے کو تمازت و طمانیت عطا کرتا ہے۔ یہاں اب نہ تمازت رہی اور نہ طمانیت کی شادابی باقی رہی۔ سوچ سوچ کر، کڑھ کڑھ کر آنکھوں میں سیاہ

میرے پر اہل کو حلقے پڑ گئے۔ لامحالہ پڑھائی پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔ ایک لیکچرار سمجھدار ہمدرد دل تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی۔ مجھے پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ جب کالج ٹیسٹ میں فیل ہو گئی اور میرا داخلہ نہ گیا تو اس ٹیچر نے میرا سفارشی داخلہ کالج کی طرف سے بھجوا دیا۔ میں اپنا آپ اچھا بنانے کی کوشش کرتی، خود کو امیر، لائق کہتی مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح امیج خراب ہوتا۔ میں وہیں میں آتی جاتی تھی مگر کالج میں لڑکیوں سے کہنی کہ میرے گھر میں چار گاڑیاں ہیں۔ ایک امی کی، ایک ابو کی، ایک بھائی کی اور میری مگر مجھے گاڑی چلائی نہیں آئی اور ڈرائیور نہیں ہے لہذا وہیں میں آجاتی ہوں۔ اپنا گھر بھی ایک پوش علاقے میں بتاتی۔ میرا گھر پہلے ایک ایسے محلے میں تھا جہاں شرفا رہا کرتے تھے پھر امی اور میرے اصرار پر ابو نے بنگلہ ٹائپ مکان ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ امی کہتیں کہ اس کی سہیلیاں اونچے گھروں کی ہیں اور یہ ان کو شرم سے اس گھر میں نہیں بلاتی کہ وہ اچھے علاقوں میں رہتی ہیں۔ ہمارا علاقہ غریبوں کا ہے، بھلا یہاں وہ ان کو کیوں بلانے۔ اگر اچھے لوگ نہیں آئیں گے تو امیر گھر انے میں ساثرہ کا رشتہ کیسے ہوگا؟ امی کی ان باتوں نے والد صاحب کو اپنا چھوٹا سا ذاتی مکان بیچنے پر مجبور کر دیا۔ اب انہوں نے ایک بنگلہ نما مکان ڈھونڈ تو لیا جو نسبتاً کم قیمت پر مل رہا تھا لیکن اس کا پڑوس اچھا نہ تھا یعنی وہاں ایک ایسی عمر رسیدہ عورت رہتی تھی جو کسی زمانے میں طوائف رہ چکی تھی، غالباً اس وجہ سے مکان کی قیمت کم تھی کہ شرفا اس گھر کو خریدنے سے کتراتے تھے۔ والد صاحب نے کچھ قرضہ سود پر لیا اور یہ گھر خرید لیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ عورت کبھی طوائف تھی اور بعد میں کچھ عرصہ فلموں میں بھی کام کیا تھا۔ بہر حال اب یہ عورت نیک چلن سے زندگی بسر کر رہی تھی تب ہی اس کے لوگ اس کو برداشت کئے ہوئے تھے۔ اس کا نام پروین تھا اور طنز یا ویسے ہی محلے والے اسے نیک پروین کہتے تھے۔ کافی خوبصورت تھی۔ امی کی اس کے ساتھ دوستی فلم بینی کے شوق مشترک کی وجہ سے ہوئی کیونکہ نیک پروین کے پاس بہت سی پرانی انٹین فلموں کی کاپیاں تھیں جو وہ امی کو دیتی رہتی تھی۔ خود پروین کی زبانی پتہ چلا کہ کسی زمانے میں فلم اسٹار رہی تھی۔ فلم اسٹار تو میرا انیڈیل تھے، پس پروین بھی میرا انیڈیل بن گئی۔ وہ بڑی سلیقہ مند، شیریں زبان اور بنی سنوری رہنے والی عورت تھی۔ تب ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک روز اس جیسی بنوں گی۔ نئی جگہ انے سے کالج اور دور ہو گیا۔ آنے جانے میں تھک جاتی تھی۔ پڑھائی پر برا اثر پڑا اور بی اے میں چار مضامین میں فیل ہو گئی۔ گھر اور خاندان والوں کے طعنے، بے عزتی اپنی جگہ تھے۔ میری دشمن کلاس فیلوز کی تو عید ہو گئی۔ کچھ شریر لڑکیوں نے میرا موبائل نمبر ایک لڑکے کو دے دیا جو مجھے گھٹیا پیغامات بھجوانے کے ساتھ ساتھ فیل ہونے پر مبارکباد دیتا اور خوب ہنستا۔ فیل ہو جانے کے بعد میرا جینا دوبھر ہوا تو دماغ کی کیفیت عجیب و غریب ہو گئی۔ تب ایک دن میں نے عجیب و غریب فیصلہ کر لیا۔ لاہور کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ سوچا جا کر قسمت آزمانا چاہیے، سو میں قسمت آزمانے گئی۔ روشنیوں کے شہر لاہور کے لئے ٹکٹ لے کر بس میں بیٹھ گئی۔ بغیر یہ سوچے کہ کہاں جا کر رہوں گی۔ بس جذبات کی جولانیاں مد نظر تھیں۔ آف کس قدر بے وقوف تھی۔ ایسا تو صرف فلمی دنیا میں ہوتا ہے، اصل زندگی میں کب ایسا ہوتا ہے! جب بس آگے پر رکی تو میں اتر کر رکشے میں جا بیٹھی۔ رکشے والے نے پوچھا کہاں جانا ہے؟ کہا کہ قریب جانا ہے، سیدھا چلتے چلو، آگے بتا دوں گی۔ یوں میں کبھی ادھر کبھی ادھر اسے گھماتے لگی۔ تب اس نے تنگ آکر پوچھا۔ ارے بی بی صحیح طرح سے بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟ مجھے اور تو کچھ نہ سوچھا اتنا بولی جہاں فلم ایکٹریس رہتی ہیں وہاں لے چلو۔ کہنے لگا کیا بازار حسن؟ معاف کرو، میں ان جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا کیونکہ میں ایک شریف آدمی ہوں، تم اترو یہاں اور جہاں جانا ہے خود چلی جاؤ۔ اس نے مجھے ایک فاسٹ فوڈ ہوٹل کے قریب اتار دیا۔ ہوٹل میں انگریزی گانے لگے تھے اور مائٹرن لڑکے لڑکیاں بیٹھے تھے۔ ابھی تک میری آنکھوں میں ایک بڑی اداکارہ بننے کے خواب سجے ہوئے تھے۔ یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میں اخباروں کی زینت بنوں گی اور لوگ میری تصویریں دیکھ دیکھ کر نہ تھکیں گے۔ والد تب پنڈی میں ایک اعلیٰ طرز کا بنگلہ، پوش ایریا میں خرید لیں گے تو لوگ ان کو سلام کریں گے اور وہ خوب سر اونچا کر کے تن کر چلیں گے۔ رات گزرتی جاتی تھی۔ اچانک میں نے سامنے کے رخ پر چلنا شروع کر دیا، سوچا کہ کوئی سستا سا ہوٹل دیکھوں۔ رات گزار لوں صبح کسی طرح فلم اسٹوڈیو کا پتہ کروں گی۔ یہی سوچتی جا رہی تھی کہ ایک قیمتی مرسیڈیز گاڑی پاس سے گزری، اس میں حسین نوجوان بیٹھا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر تھپک گئی تو اس نے گاڑی روک لی۔ یہ جگہ لارنس گارڈن کے قریب تھی۔ میں خوش تھی کہ چلو یہ امیر زادہ مل گیا۔ اس نے کھڑکی سے منہ نکال کر پوچھا۔ کہاں جانا ہے، اگر سواری نہیں مل رہی تو چھوڑ دوں۔ میں نے فوراً کہا کہ ہاں بڑی دیر سے سواری دیکھ رہی ہوں اس نے دروازہ کھول دیا اور میں جلدی سے یوں اس کی گاڑی میں گھسی جیسے ٹوہتے کو کوئی بڑا سپارا مل جائے کہاں جانا ہے؟ اس نے پہلا سوال کیا۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ میں نے بغیر توقف جواب دیا تو وہ حیران ہو گیا۔ تب ہی توجہ سے مجھے کو دیکھ کر ہولا لگتی تو ایسی نہیں ہو، چکر کیا ہے؟ ملتان سے آ رہی ہوں۔ سنا ہے لاہور میں فلمیں بنتی ہیں۔ مجھے اداکاری کا شوق ہے، اس لئے آئی ہوں۔ یہ سنتے ہی فہم مار کر ہنسنا، اتنا ہنسنا کہ گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوئے بچا۔ میری صورت دیکھ کر اس کو میری بات کا یقین آگیا تھا کیونکہ ایک چھوٹا سا سفری بیگ بھی ساتھ تھا۔ بہر حال وہ مجھے گھر لے آیا اور اپنی پیاری سی بیوی کو سارا احوال سنایا۔ وہ پہلے تو ہنسنے لگی پھر سنجیدہ ہو گئی اور مجھے سمجھانے لگی۔ تب مجھ کو غصہ آنے لگا کہ یہ کیوں مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میں نے ایسا کون سا لطیفہ سنا دیا ہے۔ میرا موڈ آف دیکھ کر وہ بولی۔ شکر ہے کہ تم غلط باتوں میں نہیں پڑیں ورنہ ابھی تک تمہارا جانے کیا حال ہوتا۔ دونوں میاں بیوی مجھے کافی دیر تک سمجھاتے رہے کہ اس طرح فلم اسٹار نہیں بنتے، عزت ضرور مٹی میں مل جاتی ہے۔ یوں بھی فلم اسٹار بننا مشکل ہے، اگر بن جاؤ تو ٹھوکریں کھا کھا کر جینا پڑتا ہے۔ شرافت ہی عورت کا اصل زیور ہے۔ اداکارہ بن کر عورت کو بہت کچھ مل جاتا ہے مگر سکھ چیں تو تقدیر سے ہی ملتا ہے۔ انہوں نے پیار سے باتیں کیں، کھانا دیا اور ان کی باتوں نے میرے دل میں جگہ بنائی۔ ان کے گھر ایک نوکر تھا جو خاصا بوڑھا اور بدشکل تھا۔ بس نام کا چوکیدار تھا ورنہ چوکیداری کے لئے قطعی موزوں نہ تھا۔ نام اس کا خادم حسین تھا۔ مجھے وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا تاہم وہ مجھ کو بڑی توجہ سے کام کرتے دیکھتا۔ ایک دن سیٹھ ندیم اور ان کی بیوی ثناء بیٹھے تھے کہ مجھے بلا کر کہا۔ ہم تمہارا گھر آباد کرنا چاہتے ہیں، تمہیں اعتراض تو نہیں کیونکہ آخر کبھی نہ کبھی لڑکی کو شادی کر کے گھر آباد کرنا پڑتا ہے۔ میں چپ رہی تب ثناء باجی کہنے لگی کہ خادم حسین بڑا شریف آدمی ہے، تمہارا بھی کوئی نہیں ہے، وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھے جھٹکا لگا مگر ثناء باجی نے اپنی میٹھی زبان سے مجھے کو رام کر لیا اور لاوارث ظاہر کرنے کی وجہ سے مجھے کو

اس منحوس سے شادی کرنی پڑی۔ نکاح کے بعد خادم حسین مجھ کو گوجرانوالہ لے گیا، جب میں نے اس کا گندہ گھر دیکھا تو اس کے غربت زدہ ماحول سے گھن آنے لگی۔ اس سے میرے والد کا گھر کہیں بڑا تھا جہاں میں نے اگلوٹی بیٹی ہونے کی وجہ سے شہزادیوں کی مانند پرورش پائی تھی۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ خادم حسین کی میں دوسری بیوی ہوں۔ اس کی پہلی بیوی موجود تھی جس کا نام رضیہ بیگم تھا اور وہ شکل سے چڑیل لگتی تھی۔ لیکن اب سوائے صبر کے چارہ کیا تھا۔ کئی دن تک میں نے برداشت کیا۔ اس کی بیوی اور بچوں کی تو لگتا تھا کہ میں ملازمہ ہوں۔ وہ سارے گھر کا کام مجھ سے کراتی۔ ایک دن جب میں برتن دھو رہی تھی، خادم دو بدمعاش قسم کے آدمی لے آیا تب میں اس کی کم عقلی پر حیران رہ گئی کہ وہ پرانے آدمیوں کو اپنی بیوی دکھا رہا تھا۔ وہ دونوں میری طرف ایسے گھور رہے تھے جیسے قصائی بکری کو دیکھتے ہیں۔ ایک نے دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی جس کا مطلب تھا، تھیک ہے لے لو اور ہزار روپے کے نوٹوں کی گٹیاں جیب سے نکال کر انہوں نے خادم حسین کو دیں۔ وہ خستہ حال ان نوٹوں سے جیب بھر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا شاید کہ ان نوٹوں میں اس کی غربت کا علاج اور بچوں کا شاندار مستقبل چھپا ہوا تھا۔ رقم ادا کرتے ہی ان دونوں عفریتوں نے مجھے کانچ کی گڑیا کی طرح پکڑا اور اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ اس وقت رضیہ کے چہرے پر فتح کی چمک تھی۔ شاید اسی لئے وہ خاموش رہی تھی کہ خادم حسین نے اس کو سمجھا دیا تھا، یہ سونے کی چڑیا ہے، یہ بکے گی تو دام کھرے ہوں گے۔ تب ان روپوں سے تجھے سونے کے زیور بنوا کر دوں گا۔ اس کے بعد میرے ساتھ بھی وہی ہوا جو مجھے ایسی خواب پرست، خود سر اور گھر سے بھٹکی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب میں زمانے کی تھوکروں میں تھی۔ اس دلدل میں کودنے کا خود شوق ہوا تھا مجھے مگر جانتی ہی تھی کہ دلدل میں ڈوبنا کس قدر اذیت بھرا ہوتا ہے۔ بھٹک جانے کے بعد جب گھر بسانے کا ارادہ کر لیا تو تقدیر مجھے کہاں لا کر چھوڑ گئی ہے۔ آج میں بازار حسن کی زینت ہوں اور یہاں سے نکلنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ میں جن لوگوں کی ملکیت ہوں، ان کا نیٹ ورک بڑا مضبوط ہے۔ ان کی رسائی دور دور تک ہے۔ جب اثر و رسوخ والوں کا من کرتا ہے، یہ ان کا دل بہلانے کا سامان لے جاتے ہیں۔ بھلا ان کے ہاتھ پھر کیوں نہ لمبے ہوں۔ مجھے اپنا گھر اور بچپن بہت یاد آتا ہے مگر کچھ نہیں کر سکتی۔ یہاں میرا کوئی ہمدرد و غمگسار نہیں ہے۔ میں لاہور میں جہاں جانا چاہتی تھی، قسمت نے مجھے وہاں نہ پہنچایا۔ فلم اسٹوڈیو کی بجائے کہاں پہنچا دیا۔ یہاں کے باسیوں نے میرا نام، میری شناخت تک چھین لی ہے۔ وہ مجھے سوہا کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں خود بھی اپنا نام اپنی ولایت کو بھول جانا چاہتی ہوں۔ اکثر تنہائی میں خود سے پوچھتی ہوں کہ مجھے ساثرہ سے سوہا کس نے بنایا تقدیر نے یا خود میری اپنی خواہشات نے میں ستم زدہ اور مظلوم ہوں یا خواہشات کی پجارن مجھے خود معلوم نہیں ہے۔"]